سورۃ الرحمٰن

سورہ رحمٰن میں ۷۸ آیات ہیں

مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ابن زبیرؓ نے کہا یہ پوری کی پوری سورۃ مکی ہے ابن مسعودؓ نے کہا یہ مدنی ہے صحیح یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱۔۲) **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (ترجمہ:۔رحمٰن نے قرآن کی تعلیم فرمایا) مفسرین نے فرمایا کہ چونکہ یہ آیت دنیوی اور اخروی نعمتوں کے بیان پر مشتمل ہے لہذا اُسے رحمان کے نام سے شروع کیا گیا۔کیونکہ وہ ذات مخزن نعم ومعدن کرم ہے۔پھر اس میں بھی اس چیز کو مقدم کیا گیا جو دینی نعمتوں کی اصل ہے اور انہیں پر مشتمل یہ اور دینی نعمتوں میں سے سب سے زیادہ بزرگ تر نعمت ہے یعنی قرآن کی تعلیم کا انعام فرمانا۔وہ دین کی اساس اور شرائع کی منشاء ہے اور وہ ہے جو کہ کتب الٰہیہ میں سے کامل ترین کتاب ہے اور بہ اعتبار بدیع بیان کے وہ سب سے معزز تر ہے۔یہاں تک وہ معجزہ بن گیا اور قیامت تک تمام انسانوں کے واسطے نافع احکام کے اصول کے اعتبا سے بھی وہ معزز ترین کتاب ہے۔

(۳) **خَلَقَ الْاِنْسَانَ** (ترجمہ:۔اس نے انسان کو پیدا فرمایا) یعنی آدم علیہ السلام کو۔

(۴) **عَلَّمَهُ الْبَيَانَ** (ترجمہ:۔اور اُسے بیان سکھایا) اور وہ (" علمه" کی) ضمیر سے معبّر ہے پس جو اللہ تعالیٰ نے شرائع اور احکامات اس کے قلب میں القاء فرمائے۔انہیں واضح فرمایا۔پس قرآن کی تعلیم اور انسان کی تخلیق اور اُسے بیان کی تعلیم دینا اسم رحمٰن کے کمالات میں سے ہے۔اور کہا گیا ہے کہ انسان سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے احکام وشرائع کا بیان سکھایا۔

(۵) **اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ** (ترجمہ:۔سورج اور چاند مقررہ حساب سے ہیں) یعنی مقررہ حساب سے چلتے ہیں جو کہ ان کے بروج ومنازل میں مقرر کیا گیا ہے اور ان کی تحویل سے موسم اور اوقات مختلف ہوتے ہیں رات دن کا تغیر ہوتا ہے اور سال ومہینے متعین ہوتے ہیں۔

(۶) **وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ** (ترجمہ:۔بوٹیاں اور درخت سجدہ کرتے ہیں) نجم ان نباتات کو کہا جاتا ہے جن کا تنا نہیں ہوتا اور شجر اس کو کہتے ہیں جس کا تنا ہوتا ہے۔اور سجود سے مراد فرمانبرداری ہے۔زجاج نے کہا ہے کہ نجم وشجر کا سجدہ کرنا ان کے ساتھ سائے کا چلتا رہنا ہے۔جیسے کہ ارشاد ربانی ہے **يَتَفَيَّؤُا ظِلَالُهُ عن اليمين والشمائل سجداً لله** (النحل ۴۸) نحاس نے کہا کہ اصل سجدہ ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا اور اس کے حکم کے آگے جھکنا۔فرا نے کہا ہے کہ **يسجدان** کے معنی ہیں سورج کے

سامنے ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ جھکتے ہیں یہاں تک کہ سایہ ختم ہوجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علام) کہ اس سے نخل ''ساجدہ'' کا لفظ ہے جس کے معنی ہے جھکی ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساجد کے معنی ہیں ''خاضع'' اسی مفہوم میں یہ ارشاد ربانی ہے الم ترىٰ ان الله يسجد له من فى السموت ومن فى الارض. (الحج ۱۸)

(۷) وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا (ترجمہ:۔اس نے آسمان کو بلند کیا) یعنی اسے بلند پیدا فرمایا۔ نیز سماء کو مبتدا کے طور پر مرفوع بھی پڑھا گیا ہے معنی یہ ہے کہ آسمان کو اس نے بلند کیا کیونکہ وہ اللہ کے احکام کا منشاء اور اس کی سلطنت وملک کی عظمت اور اس کی شان کی کبریائی اور اس کے اوامر کا محل ہے۔ وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (ترجمہ:۔اور اسی نے ترازو قائم کیا) میزان سے مراد عدل ہے جو حق وباطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ اللہ نے ہمیں عدل کا حکم دیا ہے اور اس پر یہ ارشاد ربانی دلالت کرتا ہے کہ

(۸) اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (ترجمہ:۔کہ تم تولنے میں ناانصافی مت کرو) یعنی حدِ عدل سے نہ بڑھو۔ اس سے مراد ہے مستحق کا حق پورا کرنا۔ اور اسی سے نظام عالم درست رہتا ہے اور اُسی طرف نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آسمان وزمین عدل کے ساتھ قائم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ میزان سے مراد قرآن ہے کیونکہ فیصلوں میں عدل اور عقائد وعبادات میں میانہ روی اسی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور وضع میزان سے یہ مراد لینا بھی ممکن ہے کہ حرکات سے آسمانوں کے احوال کو درست رکھنا اور ان کے نتائج بہتر طور پر برابر رکھنا۔

(۹) وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ (ترجمہ:۔اور انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو) یعنی تمام احوال اور امور میں عدل کے ساتھ قائم رکھو۔ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (ترجمہ:۔اور تولنے میں کمی نہ کرو) یعنی ناپ وتول میں کمی نہ کرو۔ جمہور نے اُسے تائے فوقانیہ کے ساتھ تُخسرو پڑھا ہے جو کہ اَخْسَرَ کے باب سے ہے۔ نیز اسے خَسِرَ کے باب سے تا اور سین کی زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۱۰) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (ترجمہ:۔اور اسی نے مخلوق کے لئے زمین رکھی) یہ اسے پانی کے اوپر بچھا کر پھیلا کر رکھا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نافع بن الارزق نے ان سے وضعها للانام کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا کہ انام کے معنی ہیں مخلوق اور وہ ایک ہزار امت ہیں جن سے چھ سو بحر میں ہے اور چار سو خشکی میں ہے۔ جس پر اس نے کہا کہ عرب لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے لبید کا یہ شعر نہیں سنا ہے جس میں وہ کہتا ہے۔

فان تسألين مم نحن فاننا عصافير من هذا الانام المسخر

ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ للانام کا مراد ہے للناس۔ صحیح یہ ہے کہ انام سے مراد جن والانس ہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (آیت نمبر ۱۲ میں) الریحان کے بعد فبای آلاء ربکما تکذبان کہا ہے۔ انام ہی کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے پہلے جنات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جنات کا ذکر اس کے بعد ہی کیا گیا ہے۔ خلق الانسان من صلصال كالفخار وخلق الجان من

نار ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ **الانام** سے مراد جن وانس ہی ہے اور **ربکما تکذبان** میں ان ہی دونوں کو خطاب درست ہے۔

(۱۱) **فِيهَا** (ترجمہ:۔اس میں) یعنی زمین میں **فَاكِهَةٌ** (ترجمہ:۔میوے ہیں) جن سے لذت حاصل کی جاتی ہے۔ **وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ** (ترجمہ:۔غلاف والی کھجوریں) پھل کا برتن یہ **كَمٌّ** کی جمع ہے اور ہر وہ چیز جو چھال وغزہ ہے چھپالی جائے۔پس ان چیزوں سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

(۱۲) **وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ** (ترجمہ:۔اور بھوسے والا غلّہ اور خوشبودار پھول ہیں) حب سے مراد گندم اور جو اور تمام چیزیں ہیں جن سے غذا حاصل کی جاتی ہے۔اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ **عصف** اسے کہتے ہیں جو کھیت سے کاٹا جاتا ہے پھر اُسے کھایا جاتا ہے اور اُسے **عصفية** (ایسے پتے جن کے درمیان خوشہ ہو) کہا جاتا ہے۔نیز کہا گیا ہے کہ **عصف** کے معنی ہیں کھیتی کے پتے بعض نے کہا ہے کہ **ذوالعصف** سے مراد اناج اور پھولوں میں سے کھائی جانے والی چیزیں ہیں اور صحیح یہی ہے کہ **العصف** ہر وہ چیز جو کھائی جاتی ہے۔نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ **عصف و ریحان** سے مراد کھیتی کے وہ پتے ہیں جو جڑوں میں گرتے ہیں وہ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔فرا نے کہا ہے کہ عرب لوگ جب کھیتی کو پکنے سے پہلے کاٹتے ہیں تو کہتے ہیں کہ **خرجنانعصف الزرع**۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ **العصف** سے مراد بھوسہ ہے اور **ریحان** سے کھیتی کا سبزہ اور **ریحان** سے مراد سونگھی جانے والی چیز یا کھائی جانے والی چیز ہے۔یہ مفہوم عرب کے اس قول سے لیا گیا ہے جس میں کہا جاتا ہے **خرجت لطلب ریحان الله** (یعنی اللہ کے رزق کی تلاش میں نکلنا) محبّ نے **ذی العصف والریحان** بھی پڑھا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے دانے کو **عصف** اور **ریحان** والا پیدا فرمایا ہے۔

(۱۳) **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) یعنی تم اپنے رب کی کس کس نعمت کی ناشکری کرو گے۔یہ جن وانس سے خطاب ہے کیونکہ **انام** کے لفظ میں دونوں شامل ہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔اور **آلاء** کے معنی ہیں ''**النعم**''اس کا واحد ھمزہ کے زبر کے ساتھ **ألیً** اور زیر کے ساتھ **اِلیً** ہے۔جوہری نے کہا ہے کہ اسے زیر دی جاتی ہے۔اور ''ی'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔جیسے **معی** اور **امعاء**۔آیت میں حرف ''فا'' نعمتوں کی کثرت اور مختلف اقسام پر دلالت کرتا ہے اور استفہام نعمتوں کے کفران نعمت پر انکار اور توبیخ کیلئے ہے۔امام رازی نے فرمایا ہے کہ آیت میں لفظ رب کا ذکر اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ رحمت کی طرف اشارہ ہے۔اس میں خطاب بطور التفات ہے اور اس سے مراد تقریر اور زجر ہے۔یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ منعم کا شکر بجالانا واجب ہے۔امام حاکم حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ رحمٰن پڑھی یہاں تک کہ اسے پورا کیا اور کہا میں تمہیں خاموش دیکھ رہا ہوں جبکہ جنّات تم سے بہتر جواب دینے والے تھے میں نے ان پر جب بھی آیات پڑھی تو انہوں نے جواباً یہی کہا **ولا بشئی من نعمک ربنا مکذب فلک الحمد** پس مومن پر لازم ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرے اور اس کی حمد کرے خاص طور پر جب اس سورت کو پڑھے یا دوسرے سے سنے تو اس پر اللہ کی حمد وثنا اور

تعریف لازم ہے .

(۱۴) **خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ** (ترجمہ:۔انسان کو پیدا کیا کھنکھناتی مٹی سے) یعنی خشک مٹی سے جس میں آواز ہو۔ یہ ابی اسحاق کا قول ہے اور اسی سے **صلصلۃ الجرس** لیا گیا ہے جیسے کہ وصی کے بیان میں آیا ہے کہ **کانہ صلصلۃ علی صفوان**۔ابن عباس فرماتے ہیں کہ **صلصال** کہتے ہیں زمین پر پانی لگنے کے بعد اس کا پھٹ کر خشک ہو جانا اور پھر ان سوراخوں سے ہوا کا گزرتے ہوئے آواز پیدا ہونا۔مجاہد نے کہا ہے کہ **صلصال، حماء مسنون** کو کہتے ہیں۔(بدبودار کیچڑ) ازہری کہتا ہے کہ اس کو **حماء مسنون** اسی لئے کہا ہے کہ اسے **صلصال** کی تفسیر قرار دیا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ **صلصال** بہ معنی **صَلَّ** کے ہیں۔جس کے معنی ہیں بدبودار ہوا۔ جوہری کہتا ہے کہ **صلصال** وہ گرم مٹی ہے جو ریت سے ملی ہوئی ہو۔اہل لغت نے اس کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے کیونکہ انہوں نے قرآن کے اندر آدمؑ کی تخلیق کے بارے میں مختلف آیات دیکھی ہیں آل عمران میں فرمایا گیا ہے کہ **من تراب** جس کی وجہ سے جوہری نے کہا **صلصال** ریت میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں اور سورہ الحجر میں کہا گیا ہے **من حماءٍ مسنونٍ** جس کی وجہ سے مجاہد نے کہا کہ **صلصال حماء مسنون** ہی ہے۔اور یہی رائے ازہری کی ہے سورہ "**الصافات**" میں فرمایا گیا **من طین لازب** (چپکنے والی مٹی سے) اور یہی جوہری کا میلان ہے۔ابوزید نے "**الجمھرۃ**" میں کہا ہے کہ **صلصال** کہتے ہیں متفرق ہونے والے گارے مٹی کو جس میں آواز ہو اور اسی سے امیہ بن سلف کا شعر ہے۔

کیف الجحود وانما خلق الفتی من طین صلصال له فخّار

امام رازی نے ان تمام اختلافات کو ختم کرنے کے لئے فرمایا کہ آدمؑ پہلے تراب سے پیدا کئے گئے۔ بعد میں وہ طین بنائے گئے پھر **حماء مسنون** اور پھر وہ **لازب** ہوا۔ گویا کہ اللہ نے اسے ان تمام مراحل سے گذار کر پیدا فرمایا۔لہذا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ **کَالْفَخَّارِ** (ترجمہ:۔ٹھیکری کی طرح) آگ میں پکی ہوئی مٹی۔معنی یہ ہیں کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے جو خشک ہونے میں ٹھیکری سے مشابہ ہے۔اور انسان سے مراد آدمؑ ہیں۔اور وہ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔البتہ ان کی اولاد بے وقعت پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ظاہر یہ ہے کہ انسان موالید ثلاثہ کی طرح عناصر سے بنایا گیا۔مثلاً پانی، مٹی، آگ اور ہوا۔لیکن چونکہ اس میں مٹی کا جز وباقی اجزاء پر غالب ہے۔اس وجہ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ٹھیکری کی طرح کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔بعض علماء نے فرمایا کہ انسان کا جسم مٹی سے، اس کی روح پانی سے، غیض وغضب آگ سے، اور اس کی حرکت ہوا سے ہے۔ یہ کلام خطابی ہے کیونکہ اس کا جسم محض مٹی سے کیوں کر تکوین پذیر ہو سکتا ہے۔اس لئے کہ خالی مٹی میں چمٹنے اور جڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔لہذا اکیلی **حماءِ مسنون** سے انسانی جسم کا مرتب ہونا درست نہیں ہے۔ بلکہ اس کا جسم اربع عناصر سے مرکب ہے جیسے کہ علم طبعی میں ثابت کیا گیا ہے اور انسان کا نفس جوہر لطیف ہے جو کہ عالم امر میں سے ہے۔جس کی اصل حقیقت کو نہیں پہچانا جا سکتا اور اس بارے میں حکماء کے اقوال محض ظنّی ہیں جو کہ پیاسے شخص کی سیری نہیں کر سکتے۔

(۱۵) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (ترجمہ:۔اور جنات کو خالص آگ کے شعلے سے پیدا کیا) مارج کے معنی ہیں سخت آگ والا بلند شعلہ۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مارج آگ کے دھویں سے ملاوٹی شعلہ کو کہا جاتا ہے۔فراء نے کہا ہے یہاں پر آگ ان بجلیوں کے پردے کے بغیر مراد ہے۔ابوعبیدہ نے کہا ہے اس سے مراد وہ چیز کہ آگ سے خلط ملط ہو کیونکہ مارج کے معنی خلط ملط ہونا ہے۔اور جوہری نے کہا ہے کہ مارج وہ آگ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔حضرت عائشہ کی حدیث میں مروی ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے اور جنات "مارج من نار" سے پیدا کئے گئے ہیں اور آگ کا سیاہی ملا ہوا دھواں ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مارج پیلاہٹ سرخی اور سبزی کے اختلاط کو کہا جاتا ہے۔اور اس آیت میں پہلی من بیان کے لئے ہے اور دوسری تبعیض ہے اور جان سے مراد ابو الجن یعنی ابلیس ہے۔حسن کا قول ہے اور مجاہد کہتا ہے کہ اس سے مراد ابو الجن ہے اور وہ ابلیس نہیں ہے۔

(۱۶) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو اے جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۱۷) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (ترجمہ:۔وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا رب ہے) جمہور علماء نے رب المشرقین کو مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔یعنی وہ ان دونوں کا رب ہے۔ابوحیاۃ اور ابن ابی عبلۃ نے اسے ربکما سے اس کے بدل پڑھا ہے۔ابن عباس فرماتے ہیں کہ گرمی میں سورج کے نکلنے کی جگہ بلند ہوتی ہے اور سردی میں سورج کے نکلنے کی جگہ پستی میں ہوتی ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دو مشرقوں سے مراد چاند اور سورج کا مشرق اور انہی کا مغرب ہے۔اور یہ کہا گیا کہ مشرقین سے مراد شمس و فجر کا مشرق ہے اور مغربین سے مراد شمس اور شفق کا مغرب ہے۔

(۱۸) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو پھر اے جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۱۹) مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ (ترجمہ:۔اس نے دو دریا رواں کئے جو آپس میں ملتے ہیں) المرج کے معنی ہیں بہانا جاری کرنا۔فراء نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں سمندروں کو جاری کیا پھر بعد میں دونوں کو ملایا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں کو رواں کیا۔اور پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ رہے کہ آپس میں سے ملتے نہیں۔زجاج نے کہا کہ مرج کے معنی ہیں خلط یعنی نمکین سمندر اور میٹھے سمندر کو ملا دیا۔ابن اعرابی نے کہا کہ المرج کے معنی ہیں الاجراء۔اس صورت میں معنی یہ ہوں گے (ہم نے ان دونوں کو جاری کیا) اخفش نے کہا ہے کہ مرج البحرین کی طرح امرج البحرین کہا جاتا ہے۔یعنی فعل اور افعل ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(۲۰) بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ (ترجمہ:۔ان دونوں کے درمیان آڑ ہے) یعنی رکاوٹ۔لَّا يَبْغِيٰنِ (ترجمہ:۔ایک دوسرے کی طرف تجاوز نہیں کر سکتے)

(۲۱) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو اے جن وانس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)۔مقصد یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتا کہ اس سے خلط ملط ہو جائے۔ابن عباس نے کہا ہے کہ دو

سمندر جاری کئے دونوں کے درمیان رکاوٹ ہے درمیان میں بعد کی وجہ سے آپس میں مختلط نہیں ہوتے یعنی ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتا۔

(۲۲) **یَخۡرُجُ** (ترجمہ:۔نکلتے ہیں) جمہور نے اس بناء فاعل کے طور پر پڑھا ہے۔ نیز اسے مفعول کی طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ **مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ** (ترجمہ:۔ان دونوں میں سے موتی) **وَالۡمَرۡجَانُ** (ترجمہ:۔اور مرجان) مونگے۔ **المرجان** کے معنی ہیں سرخ گھونگھے' کوڑیاں وغیرہ' فراء نے کہا ہے کہ **لؤ** لؤ بڑے ہوتے ہیں اور موتی اور مرجان چھوٹے موتی ہوتے ہیں۔ **مرجان** کا واحد **مرجانة** ہے۔ازہری کہتا ہے کہ یہ رباعی یا ثلاثی باب میں سے ہے۔حالانکہ اُسے رباعی باب کے اندر لایا گیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ **مرجان** بَسَّدُ کو کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں سرخ جوہر۔ابن عباسؓ نے کہا ہے اور جمہور کی بھی یہی رائے ہے کہ مرجان چھوٹے موتیوں کو کہا جاتا ہے۔یہی جوہری نے بھی ذکر کیا ہے۔اخفش کہتا ہے کہ بعض کا گمان یہ ہے کہ مرجان کو میٹھے سمندر میں سے پیدا کرتا ہے۔ زجاج کہتا ہے کہ ان دونوں سمندروں میں سے موتی نکالتا ہے حالانکہ یہ نمکین سمندر میں سے نکلتے ہیں میٹھے میں سے نہیں۔ یہ اس لئے کہ کسی میں سے نکلتے ہو تو گویا ان دونوں میں سے نکلے۔ ابوعلی فارسی کہتا ہے یہاں پر مضاف محذوف ہے یعنی **من احدهما** جس طرح آیت **علی رجل من القریتین عظیم**(الزخرف ۳۱) میں ہے یعنی **من احدهما** . اور جس طرح آپ کہتے ہیں **خرجت من البلد** ۔حالانکہ آپ شہر کے کسی ایک محلّہ سے ہی نکلتے تھے۔صاحب کشاف کا بھی یہی نظریہ ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے **لؤ لؤ** اور **مرجان** اختلاط بحر سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ موتی نمکین پانی میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس میں سے نکل کر میٹھے پانی میں جاتا ہے۔امام رازی فرماتے ہیں کہ لوگوں کے کلام کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو قبول کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔ابوعبداللہ اور ابو مالک کہتے ہیں کہ مرجان سرخ رنگ کا پتھر ہے اور زجاج کہتا ہے کہ انتہائی سفید رنگ کا پتھر ہے۔اور قاضی ابویعلی نے کہا ہے کہ یہ **قصبان** (گنے کی گانٹھ) کی طرح موتی کی قسم ہے اور **مرجان** عجمی لفظ ہے جسے عربی بنایا گیا ہے۔ابوطلحہ نے اس تیسرے لام کی زیر کے ساتھ **اللولؤ** بھی پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔عبداللونی نے **همزه** کو یائے ساکنہ کے ساتھ تبدیل کیا ہے۔جس کا ماقبل مکسور کے بعد۔ یہ بھی لغت ہے۔

(۲۳) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۲۴) **وَلَهُ الۡجَوَارِ الۡمُنۡشَئٰتُ** (ترجمہ:۔اور اسی کی ہیں چلنے والی کشتیاں) "جوار" جار کی جمع ہے۔جس کے معنی ہیں کشتی اسے جاریہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ سمندر میں چلتی ہے اسی طرح باندی کو بھی جاریہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کی حوائج کی تکمیل کے لئے چلتی رہتی ہے۔جیسے کہ اللہ کا ارشاد گرامی ہے **انا لما طغا الماء حملنا کم فی الجاریة**(الحاقة ۱۱) اور دریا میں چلنے سے پہلے اسے **فلک** کہا جاتا ہے۔ **منشئٰت** کے معنی ہیں **المرفوعات** یعنی جس میں ایک دوسرے پر لکڑیوں کے ذریعہ اطراف کو بلند کیا گیا ہو۔قتادہ کہتا ہے کہ جو چیز چلنے کے لئے بنائی گئی ہو انہیں **منشئت** کہتے ہیں۔اخفش کہتے ہیں **المنشئت** کہتے ہیں **المجریات**

(چلنے والی چیزیں) جمہور نے انشاء کے باب سے اس لفظ کو ''ش'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اُسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے واسطے بنایا۔ اعمش، حمزہ، زید بن علی طلحہ اور ابوبکر نے اس کے برعکس ''ش'' کے زیر سے پڑھا ہے۔ جس کے معنی ہیں الرافعات یعنی وہ موجوں کو بلند کرتی ہیں جو انہیں چلاتی ہیں یا وہ چیز آگے پیچھے کے سفر کو پیدا کرتی ہو اور ابن ابی عُبلہ اور حسن نے ''ش'' کی تشدید کے ساتھ پڑھا۔ **فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ** (ترجمہ:۔ سمندر میں پہاڑوں کی طرح) یعنی کشتیاں سمندر میں ایسی ہیں جیسے کہ خشکی پر جبل اور علم پہاڑ کو کہتے ہیں۔ لحیانی کہتا ہے کہ اعلام، جبل کو کہتے ہیں۔ چاہے طویل ہو یا قصیر۔ اور بعض افراد نے اسے طویل سے مقید کیا ہے۔

(۲۵) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔ تو تم نے اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۲۶) **کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ** (ترجمہ: جو بھی اس (زمین) پر ہے فانی ہے) یعنی جنات وانسان کی مخلوق میں سے جو زمین پر ہے۔

(۲۷) **وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ** (ترجمہ:۔ ترے رب کی ذات باقی ہے) اسمیں خطاب نبیؐ کو ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب عمومی ہے یعنی اے سامع **ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ** (ترجمہ:۔ عظمت وبزرگی والا ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ وہ ہر اس چیز سے پاک ہے جو اسکی شان کے خلاف ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا **الظوا بیاذالجلال والاکرام** اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے کہ **الظوا** کے معنی **الزموا** یعنی **یاذی الجلال والاکرام** کا وظیفہ کرو۔

(۲۸) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔)

(۲۹) **یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔ آسمانوں اور زمین کی ہر شئے اسی سے سوال کرتی ہے) یعنی جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے اللہ کا سوالی ہے کیونکہ وہ سب اپنی ذات وصفات اور حسن معاشرہ معاد کی ضروریات میں اسی کے محتاج ہیں۔ ابوصالح کہتا ہے آسمان والے مغفرت مانگتے ہیں رزق نہیں مانگتے اور زمین والے اس سے دونوں چیزیں مانگتے ہیں۔ **کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ** (ترجمہ:۔ وہ ہر آن نئی شان میں ہے) یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر آن افراد اور نئے احوال پیدا فرماتا رہتا ہے۔ جس طرح اس کی قضاء کے اندر طئے کر چکا ہوتا ہے۔ یہ آیت مبارکہ کے تجدد امثال کے بارے میں صوفیاء کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ ابن عینیہ کہتے ہیں کہ سارا دھر اللہ کے نزدیک دو دن ہیں ایک ان میں سے آج کا دور جو دنیا کی مدت ہے اور دوسرا ہے قیامت کا دن۔ لہذا پہلے دن میں امر ونہی زندگی وموت ہے۔ دوسرے میں حساب وجزاء ہے۔

(۳۰) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۳۱) **سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ** (ترجمہ:۔ اے دو بھاری گروہ ہم عنقریب تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں)۔ ابن الاعرابی کہتا ہے کہ **سنفرغ** کے معنی ہیں **سنعمد** اور **سنقصد** اور اسی سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حدیث ہے ''**افرغ الی اضیافک**'' یعنی اپنے مہمانوں کا قصد کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **سنفرغ** کے معنی ہیں **ننظر فی یوم القیامة** یعنی ہم قیامت کے

دن تمہیں دیکھیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مصروفیت سے فارغ ہے اور یہ انداز کلام' کلام عرب میں اس معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ **سیقصد لحسابکم**۔ لہذا یہ بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس آدمی کی گفتگو سے جو کسی کو ڈرا رہا ہو کہ ابھی میں تیرے لئے فارغ ہوتا ہوں۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اس سے یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ عنقریب دنیا ختم ہو کر اپنے انجام کو پہنچنے والی ہے۔ اور اس وقت مخلوق کے حالات و معاملات جن کے لئے فرمایا گیا ہے **کل یوم ھو فی شان** وہ انتہا کو پہنچ جائیں گے۔ پس کوئی بھی شان باقی نہیں رہے گی سوائے ایک شان کے اور وہ ہے تمہاری جزا۔ اس لئے اس شان کو بطریق مثال فراغت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جمہور نے "سنفرغ" میں نون کو نونِ عظمت کے طور پر پڑھا ہے اور "فرغ" کے باب میں سے تفرغ کو "ر" کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور حمزہ' کسائی اور زید بن علی نے سیفرغ بھی پڑھا ہے جبکہ قتادہ اور اعرج نے نون اور 'را' کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ تمیم کی لغت کے طور پر ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ قبیلہ مضر کی لغت ہے۔ ثقلین سے مراد جن وانس ہیں اور دراصل "ثقل" عرب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نفیس' متبرک اور محفوظ ہو۔ لہذا اللہ نے جن وانس کو ان کی شان' عظمت اور قدر افزائی کے لئے ثقلین فرمایا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ ثقلین سے مراد جن وانس ہوں کیونکہ وہ مکلّف ہیں۔ اوامر و نواہی مثلاً نماز' روزہ' زکواۃ اور وہ تمام امور جن کا اللہ نے انہیں کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان پر عمل کرنا یا مثلاً حرام اور مکروہ وہ تمام چیزیں جن سے اللہ نے تمہیں منع کیا ہے ان سے پرہیز کرنا یہ چیزیں ان پر ثقیل ہیں انہیں تکلف اور مشقت کے بعد ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے انہیں ثقلین کہا گیا ہے اور اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری زندگی میں فرمایا تھا کہ **انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی** کیونکہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل کرنا بہت ہی گراں ہے۔ اور آپ کی عترت آپ کے اہل بیت ہیں جو کہ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت میں تکالیف کو برداشت کرتے تھے۔ لہذا وہ بھی ثقلین کہلائے۔ اور اس اعتبار سے بھی کہ عرب ہر عمدہ' نفیس اور محفوظ چیز کو ثقل کہتے ہیں۔ پس قرآن کریم اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے تمام اشیاء میں سے نفیس ترین شئے ہے اور آپؐ کے اہل بیت کبیرہ گناہوں کی برائی اور شرک کے میل کچیل سے پاک وصاف ہونے کی وجہ سے محمود ہیں۔ اور کتاب اللہ اور آپ کی عترت پر ثقلین کا اطلاق کرنا نہایت ہی مناسب ہے۔

(۳۲) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔ تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۳۳) **یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْ** (ترجمہ:۔ اے گروہ جن وانس اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ نکل سکو) یعنی اگر تم نکلنے پر قادر ہو۔ **مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (ترجمہ:۔ آسمانوں اور زمینوں کے کناروں سے) یعنی اللہ کی قضاء و تقدیر سے بھاگ کر ان کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو **فَانْفُذُوْا** (ترجمہ:۔ تو نکل جاؤ) یعنی اپنے آپ کو اللہ کی تقدیر و قضاء سے نکال دکھاؤ اور آزاد کراؤ۔ **لَا تَنْفُذُوْنَ** (ترجمہ:۔ نہ جا سکو گے) یعنی جانے پر قادر نہیں ہو سکو گے پس ان سے تم نکل نہیں سکتے۔ **اِلَّا بِسُلْطٰنٍ** (ترجمہ:۔ مگر زور کے ساتھ) سوائے قوت و قہر اور ایسی قوت و غلبہ تمہارے اندر کہاں ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اس کے معنی ہیں تم میرے سلطان کے علاوہ نہیں نکل سکتے۔

(۳۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۳۵) یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ (ترجمہ:۔تم پر چھوڑے جائیں گے آگ کے شعلے) جمہور نے اسے ''یا'' کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے نیز اسے ''ن'' کے ساتھ (نرسل) اور شواظ کی نصب کے ساتھ (شواظا) بھی پڑھا گیا ہے۔مجاہد نے فرمایا ہے کہ شواظ آگ سے الگ ہرے رنگ کے شعلے کو کہا جاتا ہے۔اخفش اور ابو عمرو نے کہا ہے کہ شواظ آگ اور دھویں دونوں کو کہا جاتا ہے ضحاک فرماتے ہیں کہ شواظ شعلے سے نکلتے ہوئے دھویں کو کہا جاتا ہے۔ابن عباسؓ نے کہا ہے شواظ آگ کا شعلہ ہے۔اکثریت اس بات پر ہے کہ شواظ اس شعلے کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔اور یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔فراء کہتے ہیں کہ اکثر قراء نے اسے شُواظ ہی پڑھا ہے لیکن حسن نے اسے شِواظ ہی پڑھا ہے جس طرح گائے' بیل' کی جماعت کو صُوار اور صِوار کہا جاتا ہے۔ وَّنُحَاسٌ (ترجمہ:۔اور خالص کالا دھواں) جمہور نے اسے ''ن'' کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے نیز ''ن'' زیر کے ساتھ (نِحاس) بھی پڑھا ہے اور اسے نَحَسٌ بھی پڑھا ہے نحس کہتے ہیں پگھلائی ہوئی دھات کو۔اور فراء نے کہا ہے کہ اسے نِحاس چڑھایا گیا ہے اور اس کے معنی میں دخان (دھواں)۔ازہری کہتا ہے کہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے۔ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ نحاس ایسے بلند ہوتے ہوئے دھویں کو کہا جاتا ہے جس کی حرارت کمزور پڑھ جائے اور شعلے سے الگ ہو جائے۔ابن برزخ نے کہا ہے کہ نحاس کہتے ہیں پیلاہٹ کو اور نحاس کہتے ہیں آگ کے دھویں کو اور خلیل کہتا ہے کہ نحاس اس دھویں کو کہتے ہیں جس میں شعلہ نہ ہو اور سعید بن جبیر کا بھی یہی خیال ہے۔ضحاک کہتا ہے کہ نحاس گرم تیل کی تلچھٹ کو کہتے ہیں کسائی کے خیال پر نحاس اس آگ کو کہا جاتا ہے جس میں شدید ہوا ہو اور ابن عباسؓ نے کہا کہ نحاس آگ کا دھواں ہے اسے شواظ پر عطف کرتے ہوئے ''ش'' کے پیش کے ساتھ نیز نار پر عطف کرتے ہوئے ''ش'' کی زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔معنی یہ ہیں کہ ان کے سروں پر آگ کا شعلہ اور اس کا دھواں چھوڑا جائے گا۔فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اسے دفع نہ کر سکو گے) یعنی تم اللہ کے عذاب کو روکنے پر قادر نہیں ہو سکو گے۔

(۳۶) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۳۷) فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ (ترجمہ:۔تو آسمان پھٹ جائے گا) یعنی قیامت کے دن ملائکہ کے نزول یا صور کے پھونکے جانے سے پھٹ جائے گا۔فَکَانَتْ وَرْدَۃً (ترجمہ:۔تو وہ سرخ ہو جائے گا) الورد ہر وہ چیز جو زردی مائل خوبصورت سرخ رنگ کو کہا جاتا ہے۔یعنی آسمان زردی مائل سرخ کی طرح ہو جائے گا۔ کَالدِّھَانِ (ترجمہ:۔سرخ چمڑے کی طرح) فراء کہتا ہے کہ زردی مائل سرخ رنگ کو اس کی رنگت میں سرخ چمڑے کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔معنی یہ ہیں کہ آسمان پگھلنے کے بعد سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا۔

(۳۸) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۳۹) فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِہٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (ترجمہ:۔تو اس دن کسی کے گناہوں کے بارے میں

کسی انسان اور جن سے نہیں پوچھا جائے گا) یعنی جس دن آسمان ٹوٹ جائے گا تو کسی بھی جن وانس کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہ جائے گا۔

(۴۰) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۴۱) **یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ** (ترجمہ: مجرم اپنی صورتوں سے پہچانے جائیں گے تو انہیں پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا) ابوحیان کہتا ہے کہ یوخذ کا لفظ متعدی ہے اس کے باوجود اسے ''با'' کے ساتھ متعدی کہا گیا ہے اسلئے کہ اس میں یسحب کے معنی پوشیدہ ہیں یعنی گھسیٹے جائیں گے پیشانی کے بل۔

(۴۲) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۴۳) **ھٰذِہٖ جَھَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِھَا الْمُجْرِمُوْنَ** (ترجمہ:۔ یہ وہ جہنم ہے جس کو مجرم جھٹلایا کرتے تھے) یعنی کافر لوگ

(۴۴) **یَطُوْفُوْنَ** (ترجمہ:۔گھومیں گے) یعنی دوڑتے بھاگتے رہیں گے **بَیْنَھَا** (ترجمہ:۔اس میں) یعنی جہنم کے درمیان جو انہیں جلائے گی۔ **وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ** (ترجمہ:۔اور انتہائی کھولتے ہوئے گرم پانی میں)۔ حمیم کے معنی ہیں گرم پانی اور ''آن'' انتہا کو پہونچی ہوئی گرمی کو کہا جاتا ہے۔ابن انباری نے کہا ہے کہ آلان کے معنی ہیں کسی چیز کا انتہا کو پہنچنا۔اور اسے ''یا'' کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے (الانی) فراءٗ زجاج اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد گرامی ہے تسقیٰ من عین آنیة (الغاشیة ۵) (یعنی انتہائی گرم چشمہ سے انہیں پلایا جائے گا) معنی یہ ہے کہ فرشتے انہیں کبھی پیشانی کے بل اور کبھی پاؤں کے بل گھسیٹیں گے اور انہیں ڈانٹنے' ڈپٹنے اور ڈرانے کے طور پر کہیں گے یہ ہے جہنم جس کے وجود کا مجرم انکار کرتے تھے اور پھر وہ جہنم کے درمیان بھاگتے دوڑتے رہیں گے جو انہیں جلائے گی اور شدید ترین کھولتے پانی میں بھاگیں گے وہ ان کے چہروں پر پھینکا جائے گا تو اس سے بھی جلیں گے۔

(۴۵) **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور اس ترھیب وانداز سے حاصل ہونے والی عبرت بھی اس کی ایک نعمت ہے۔

(۴۶) **وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ** (ترجمہ:۔اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا) یہ وہ مقام ہے جس میں جن وانس حساب کے لئے کھڑے ہوں گے یہ معنی اس وقت لئے جائیں گے جب مقام اسم ظرف ہوگا۔لیکن اگر وہ مصدر میمی ہو تو اس کے معنی ہوں گے حساب کے لئے' اپنے رب کے پاس کھڑے ہونے سے' **جَنَّتٰنِ** (ترجمہ:۔دو جنتیں ہیں) ابن زبیر نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اور ابودرداء سے مروی ہے کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا **ولمن خاف مقام ربه جنتان**۔تو میں نے کہا چاہے اس نے زنا اور چوری کی ہو۔تو آپ نے فرمایا ہاں چاہے اس نے زنا اور چوری کی ہو اور چاہے

ابودرداء کی ناک خاک آلود ہوئی ہو۔ابن عباسؓ سے مروی ہے آپ لمن خاف مقام ربہ جنتان کے بارے میں فرماتے ہیں خاف اور اتقی (وہ ڈرا اور پھر اس نے تقویٰ اختیار کیا) اور خائف ہوتا ہے وہ شخص جس نے اللہ کی طاعت اختیار کی اور اس کی معصیت کو ترک کیا۔اللہ کا یہ ارشاد گرامی بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہوں گے۔کہا گیا ہے کہ ان دو جنتوں میں سے ایک تو صرف اس ڈرنے والے کے لئے ہوگی اور دوسری اس کی ازواج وخادموں کے لئے ہوگی۔مقاتل کہتا ہے کہ اس میں سے ایک جنت عدن ہے اور ایک جنت نعم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جن وانس میں سے ہر ڈرنے والے شخص کے لئے دو جنتیں ہوں گی کیونکہ مخاطب بھی جن وانس ہی ہیں۔اور صاحب کشاف نے کہا ہے کہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک جنت نیکیوں کے کرنے کی وجہ سے ہوگی اور دوسری جنت ترکِ معاصی کی وجہ سے۔کیونکہ جن وانس کا مکلّف ہونا ان دونوں پر منحصر ہے۔

(۴۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۴۸) ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (ترجمہ: (دو جنتیں) گھنی شاخوں والی ہوں گی۔"ذواتا افنان" کے معنی میں' صاحبتا افنان" اور "افنان" شاخیں یعنی درخت کی ٹہنیاں اس کا واحد فتن ہے۔زجاج کہتا ہے کہاافنان کے الوان ہے اور اس کا واحد فنّ ہے اور فنّ ہر چیز کی نوع یاقسم کو کہا جاتا ہے۔عطاء سعید بن جبیر کا بھی یہی خیال ہے۔ابومنصور کہتا ہے افنان سے مراد اگر الوان ہو تو اس کا واحد فن ہوگا اور اگر اس سے مراد (اغصان) شاخیں ہوں گی تو اس کا واحد فنن ہوگا۔ابوالھیثم کہتا ہے کہ فنونٔ اغصان میں ہونے پر اور اغصان 'شعب میں ہوتے ہیں اور شعب' سوق میں ہوتا ہے۔ان تمام فروعات کو خشک' کھر درے درخت کی فروعات کہا جاتا ہے۔اور خشک وکھردری شاخیں وہ ہوتی ہیں جو"فنون"میں ہوتی ہیں اور"تنا" جب کہ اُسے خشک وکھر درے ہونے پر کاٹ دیا جائے تو جزع مشذب کہا جاتا ہے۔سعید ابن جبیر کہتے ہیں ہر ٹہنی میں پھلوں کی مختلف قسمیں ہوں گی۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جنتیں اپنے علاوہ بھی وسعت وفضل والی ہوں گی۔یعنی کہ وہ کچھ ہوگا جن کی نفس خواہش کرے گا اور جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

(۴۹) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۵۰) فِیْهِمَا (ترجمہ:۔ان دونوں میں) یعنی اس میں سے ہر ایک کے اندر عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ (ترجمہ:۔دو چشمیں بہتے ہیں) ان دو چشموں سے مراد سلسبیل اور تسنیم ہیں۔

(۵۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۵۲) فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ (ترجمہ:۔ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں) زوجان کے معنی صنفان ہیں۔

(۵۳) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۵۴) مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ م (ترجمہ:۔بستروں پر تکیہ لگائے ہوں گے) فرش ' فراش کی جمع ہے اور متکئین

حال ہے۔خائفین کا یامدح کی وجہ سے نصب دی گئی۔ **بَطَآئِنُهَا** (ترجمہ:(ان کے استر) **بطائن . بطانة** کی جمع ہے اور **بطانة** وہ ہوتا ہے جو پیٹھ کے نیچے ہو۔زجاج کہتا ہے کہ **بطانة** وہ ہوتا ہے جو زمین سے ملا ہوا ہو۔فراء کہتا ہے کہ اندر کا حصہ پشت والا ہوتا ہے۔اور پشت والا حصہ اندر والا ہوتا ہے۔یہ اس وجہ سے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ آپ یوں کہتے ہیں **هذا ظهر السماء** اور **هذا بطن السماء** (یہ آسمان کا ظاہر ہے اور یہ آسمان کا باطن ہے) یہ اس وجہ سے کہ وہ اس کا حصہ جسے آپ دیکھتے ہیں **ظهر السماء** کہیں گے اور جو حصہ آپ نہیں دیکھتے وہ **بطن السماء** ہے۔**مِنْ اِسْتَبْرَقٍ** (ترجمہ:۔دبیز ریشم کے ہوں گے) جوہری کہتا ہے کہ **استبرق** کے معنی ہیں موٹا یا گاڑھا۔یہ فارسی لفظ معرّب ہے۔صاحب طبری نے کہا ہے کہ عربوں کے نزدیک **استبرق**، دیباج سے زیادہ دبیز اور خوبصورت ہوتا ہے۔بصرہ کے بعض کلام عرب کے اہل علم ہر اس چیز کو جو باریکی اور ریشے کے ہلکے ہوتے میں دیباج نہ ہو اسے **استبرق** کہتے ہیں۔حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کریمہ میں تمہیں استبرق کے بارے میں بتایا گیا ہے تو اس کے ظاہر کا کیا عالم ہوگا۔اور کہا گیا ہے کہ ان کا ظاہر سندس کا ہوگا۔اور سندس باریک، ملائم، دیباج کو کہتے ہیں۔اور یہ بیان ان بستروں کی انتہائی عمدگی پر دلالت کرتا ہے۔ **وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ** (ترجمہ:۔ان دونوں کے پھل قریب (جھک رہے) ہوں گے) **دانی** کے معنی قریب کے ہیں

(۵۵) **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۵۶) **فِيْهِنَّ** (ترجمہ:۔ان میں) یعنی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرنے والوں کے باغات میں **قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ** (ترجمہ:۔نیچی نگاہوں والی عورتیں ہوں گے) **قاصرات الطرف** از قسم منصوب اضافت اسم فاعل منصوبہ سے ہے۔کیونکہ اصل میں یہ یوں تھا **قاصر طر فه على كذا** یعنی وہ اپنی نگاہوں کو اپنے شوہروں ہی پر جھکائے رہیں گی غیر کی طرف نہیں اٹھائیں گے ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ابوبکر عاصم بن ایوب الوزیر کہتا ہے کہ عورتوں میں **قاصرات** وہ ہوتی ہیں جو اپنی نظروں کو مردوں سے جھکائے رہتی ہیں سوائے اپنے شوہروں کے۔اور کہا گیا ہے کہ **قاصرات** وہ عورتیں ہیں کہ جن پر مردوں کی نظریں جھکی رہیں اور وہ ان کے علاوہ کسی اور کی جانب منتقل نہ ہوں۔ **لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ** (ترجمہ:۔نہ چھوا ہوگا کوئی انسان ان (اہل جنت) سے پہلے) یعنی ان لوگوں سے پہلے جو تکیہ لگائے ہوئے بستروں پر ہیں۔اس مفہوم پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی **متكئين** دلالت کر رہا ہے اور اسی ضمن میں یہ فرمانِ الٰہی ہے **متكئين فيها على الارائك لا يرون فيها شمساً ولا زمهريرا** (الانسان ۱۳) فراء نے کہا ہے کہ طمث کے معنی ہیں (افتضاض) بکارت کو زائل کرنا۔اور دائمی نکاح۔جیسا کہ فرزدق نے کہا۔

دفعن الى ولم يطمثن قبلى وهن اصح من بيض النعام

یعنی وہ کنواری ہیں عرب کہتے ہیں **هذا جمل ما طمثه حبل قط**۔یعنی اسے چھوا نہیں ہے۔ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان سے پہلے ان کے پاس کوئی انسان قریب نہیں گیا ہوگا۔کسائی نے **لم يطمثهن** کو ''م'' کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ **وَلَا جَآنٌّ**

(ترجمہ:۔اور نہ کسی جن نے) اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جنات بھی انسانوں کی طرح مجامعت کرتے ہیں۔اور انسانوں کی طرح جماع کی خواہش ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جنات بھی جنت میں داخل ہوں گے جیسے اس میں انسان داخل ہوں گے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قاصرات طرف کی دو قسمیں ہیں ایک انسانی دوسری جنات میں سے۔اور دونوں صنفیں بکارت کے زوال سے محفوظ ہوں گی۔ یہی حمزۃ بن حبیب کا قول ہے۔البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ جنات انسانوں سے مجامعت کرتے ہیں کہ نہیں۔مشہور یہ ہے کہ انسان عورتوں کے ساتھ یہ مجامعت کرتے ہیں۔واللہ اعلم۔

(۵۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۵۸) کَاَنَّھُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (ترجمہ:۔گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں) قتادہ کہتا ہے کہ وہ مونگے کی سرخی اور یاقوت کی چمک کی طرح ہوں گی۔انہیں اس آیت میں چکناہٹ اور شفاف ہونے میں یاقوت کے ساتھ اور چکناہٹ اور خوبصورتی میں مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے اور عرب اپنی عورتوں کے اس قسم کے نام رکھتے تھے۔جیسے ''دُرّہ'' ابولہب کی بیوی کا نام ہے ''مرجانہ'' سعید کی ماں کا نام ہے۔

(۵۹) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۶۰) ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (ترجمہ:۔ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ بھی نہیں) ھل جزاء الاحسان کے اندر ھل نافیہ ہے۔اسی وجہ سے اس کے بعد خبر پر الا کا حرف داخل کیا گیا ہے۔اسی طرح ھل ینظرون الا الساعۃ اور فھل علی المرسل الا البلاغ المبین کے ارشادات میں بھی یہی بات ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں۔عمل میں احسان کی جزاء ثواب میں احسان ہوگا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ توحید کی جزاء جنت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

(۶۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۶۲) وَمِنْ دُوْنِھِمَا جَنَّتٰنِ (ترجمہ:۔اور ان دونوں کے سوا بھی دو جنتیں ہیں) یعنی مذکورہ صفات سے موصوف دو جنتوں کے علاوہ دوسری دو جنتیں ہوں گی۔کہا گیا ہے کہ وہ دو جنتیں' جنت الفردوس اور جنت الماوٰی ہیں۔اور مناسب بات یہ ہے کہ وہ دو جنتیں' جنت عدن اور جنت نعیم ہیں۔

(۶۳) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۶۴) مُدْھَآمَّتٰنِ (ترجمہ:۔دونوں نہایت گہرے سبز رنگ کی سیاہی مائل) مجاہد نے کہا ہے کہ دھمت کے معنی سیاہی ہیں یعنی دونوں باغات سیرابی کی وجہ سے گہری سبز مائل سیاہ ہوں گی۔ یہی زجاج اور ابوعبیدہ کا قول ہے مقصد یہ ہے کہ ان دونوں کی ہریالی سیاہی مائل ہوگی۔اور ہر پودہ ہرا ہوگا۔اور تمام ہریالی اور سیرابی سیاھی مائل ہوگی۔اور عراق کے شہروں کو بھی گہری ہریالی کی وجہ سے سواد کہا جاتا ہے۔

(۶۵) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۶۶) فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (ترجمہ:۔ان میں چھلکتے ہوئے (لبریز) دو چشمے ہوں گے) یعنی ان دونوں جنتوں میں ایسے چشمے ہوں گے جن سے فوارے پھوٹ رہے ہوں گے جو ان کی ہریالی میں اضافہ کرتے ہوں گے۔کہا جاتا ہے نضخ علیه الماء اس پر پانی کی بوچھار پڑی ینضخ نضخا (بوچھاڑ کا پڑنا) نضح سے مختلف ہے۔اب کہا گیا ہے کہ نَضَخَ سے مراد بغیر سوچے سمجھے بوچھار اور نضح سوچ سمجھ کر یہ عمل کرنے کو کہتے ہیں۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سخت موسلا دھار بارش کے معنی میں ہے۔حسن اور مجاہد کا قول ہے کہ اولیاء اللہ پر جنت کے گھروں میں بارش کے برسنے کی طرح کافور، عنبر اور مُشک کا چھڑکاؤ کیا جائے گا۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ دونوں چشمے پانی سے بھرے ہوئے ہوں گے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جنتیوں پر خیر و برکت کی بوچھار کرنے والے ہوں گے۔

(۶۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۶۸) فِیۡهِمَا فَاکِهَةٌ (ترجمہ:۔ان دونوں میں میوے ہیں) فاکھة اسے کہا جاتا ہے جسے غذا کے بعد لذت کے لئے کھایا جاتا ہے وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ (ترجمہ:۔اور کھجوریں اور انار ہیں) یہ فاکھة پر عطف ہے یعنی ان دونوں جنتوں میں پھل ہیں کھجوریں ہیں اور انار ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک ہر اعتبار سے پھل ہی ہے۔کیونکہ کھجور اہل عرب کے نزدیک طعام و غذا ہے۔اور غیر عرب کے نزدیک یہ پھل ہے اور انار اطباء کے نزدیک پھل اور دوا ہے یہ محض تفکه (لذّت) کے لئے خالص نہیں ہے اس لئے کھجور کا بعض لوگوں کے نزدیک غذا ہونا اور دوسروں کے نزدیک پھل ہونا ممکن ہے۔اسی طرح انار کا بعض کے لئے میوہ اور بعض کے لئے دوا ہونا جائز ہے۔اسی لئے اللہ نے پھل کے بعد ان دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔

(۶۹) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۷۰) فِیۡهِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ (ترجمہ:ان میں نیک سیرت، خوب صورت عورتیں ہیں) جمہور نے خیرات کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔اور ابی عمرو سے ''یا'' کے زبر کے ساتھ بھی مروی ہے۔گویا کہ وہ فَعَلَةٌ کے وزن پر خَیَرَةٌ کی جمع ہے۔اور حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عمدہ اخلاق اور خوبصورت چہروں والیاں ہیں۔

(۷۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۷۲) حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ (ترجمہ:۔حوریں (ہیں جو) خیموں میں ٹھیرائی ہوئی) ''حور'' کہتے ہیں آنکھوں کی سفیدی و سیاہی کے گہرا ہونے اور سیاہ حلقوں کے گول ہونے اور باریک پپوٹے اور اس کے اردگرد سفیدی ہونے کو۔ازہری کہتے ہیں حور اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک کہ آنکھوں کی سفیدی شدید نہ ہو اور جسم کا رنگ چمکتا نکھرتا نہ ہو۔اور عرب شہروں کی عورتوں کو حواریات کہتے ہیں، ان کی گوری رنگت کی وجہ سے اور ان کی نظافت کی بدولت دیہی عربوں کے میلے کچیلے جسموں سے دور ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جن حوروں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے وہ صالحہ مومنات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ آخرۃ میں انتہائی

حسن و جمال پر پیدا فرمائے گا۔ وہ اس نظریہ پر ہیں کہ حوریں انسانوں میں سے نہیں ہیں وہ نور کے تخلیق کردہ ہیں جس کی وجہ سے ملائکہ کی جنس میں سے ہیں۔ اور غیر کی طرف ارادہ نہ رکھنے پر اقتصار کئے ہوں گے یعنی وہ اپنے ہی شوہروں پر اقتصار رکریں گی۔ ان کے علاوہ کسی اور کا ارادہ نہیں کریں گی۔ اور ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گی یہی فراء کا قول ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ عرب حجلہ عروسی کو مقصورہ وقصورہ کہتے ہیں اور خیام' خیمة کی جمع ہے نیز خیم کی بھی جمع ہے اور خیم' خیمة کی جمع ہے۔ اور یہ وہ لکڑیاں ہوتی ہیں جو زمین میں گاڑی جاتی ہے اور کپڑے کے ساتھ ان پر پردہ کیا جاتا ہے تو وہ شامیانے سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے کہا جاتا ہے جنتی خیمہ ۳x۳ میل وسعت کا حامل ہوگا اور ایک کھوکھلے موتی کے اندر ہوگا۔ ابوموسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جنتی خیمہ کھوکھلا موتی ہوگا بلندی میں ۶۰ میل ہوگا اور ہر زاویہ میں مومن کے گھر والے ہوں گے جنہیں دوسرا کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ اور ان کے پاس' مومن آتا جاتے رہے گا۔

(۷۳) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔ تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۷۴) لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (ترجمہ:۔ انہیں ان سے پہلے کسی انسان اور جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا) اس کا تفصیلی بیان گذر چکا ہے۔

(۷۵) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (ترجمہ:۔ تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۷۶) مُتَّکِئِیْنَ (ترجمہ:۔ تکیے لگائے ہوں گے) یہ من خاف کا حال ہے اس لئے کہ جمع کے معنی ہیں جیسے گذر چکا یا اسے صفت ہونے کی وجہ سے نصب دیا گیا ہے۔ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ (ترجمہ:۔ ہرے قالینوں پر) جمہور نے اسے واحد کے طور پر "رفرف" پڑھا ہے۔ نیز اسے جمع کے وزن پر "رفارف" بھی پڑھا گیا ہے۔ اور خضر کو خاء کے پیش اور ضاء کے سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور یہ شاذ لغت ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "رفرف' دیباج سے نرم ہے۔ اسی سے تکیے بنائے جاتے ہیں۔ یہ ابوعبیدہؒ کا قول ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ (رفرف) جنت کے باغات کی پر بہار جگہیں ہے۔ یہ ابن جبیر' زجاج کا قول ہے۔ اور فراء سے روایت ہے کہ یہ (رفرف) بیٹھنے کی جگہیں ہیں۔ اور ابن عباسؓ اور ابن قتیبہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ رفرف سر کا تکیہ ہے۔ نیز کہا گیا ہے کہ رفرف فرش (چٹایاں) ہے اور یہ رف یَرُفُّ سے ہے اس کے معنی ہیں چمکنا۔ جب بجلی چمکتی ہے تو رف البرق ' یرف البرق کہا جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جب نابغہ جعدی نے نبی پاک ﷺ کے روبرو یہ اشعار پڑھے۔

ولا خیر فیه حلم اذا لم تکن له بوادر تحمی صفوه اذ یکدّرا

ولا خیر فی جهل اذا لم یکن له حلیم اذا ما اورد الامر اصدرا

تو رسول اللہ ﷺ نے اسے دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ لا یفضض الله فاک اللہ تیرے دانتوں کو سلامت رکھے۔ (تیرے دانت کبھی نہ ٹوٹیں) راوی کہتا ہے کہ فبقیت اسنانه ترف حتیٰ مات مرتے دم تک اس کے دانت چمکتے (سلامت) رہے اور "نهایه" میں ہے کہ وکان فاه البرد ترف اسنانه اس کا منہ ٹھنڈا اور دانت چمکتے تھے۔ اس تقدیر پر "رفرف" اس دیباج کو کہا

جاتا ہے جو چمکتا ہو۔ **وَعَبۡقَرِيٍّ حِسَانٍ** (ترجمہ:۔اور نہایت خوبصورت نفیس فرشوں پر) ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ وہ خوبصورت تکیہ جس کی زمین میں نقش ونگار بنے ہوں ''**عبقری**'' کہلاتا ہے۔فراء نے کہا ہے کہ ''**عبقری**'' موٹے فرشوں/موتی چٹائیوں' بچھونوں کو کہا جاتا ہے۔خلیل نے کہا ہے کہ عربوں کے نزدیک ہر جلیل' فاضل اور قابل فخر مرد وعورت کو'' **عبقری**'' کہتے ہیں۔ابن اثیر نے کہا ہے کہ ''**عبقر**'' بستی ہے جس میں عربوں کے بزعم جنات رہتے ہیں۔تو وہ لوگ جب کسی عمدہ اور عجیب شئے جس کا بننا مشکل اور ادق ہو دیکھتے ہیں۔یا فی نفسہ کسی عظیم چیز کو دیکھتے ہیں تو اسے اس کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے '' **عبقری**'' کہتے ہیں۔پھر اس معنی میں وسعت پیدا کی گئی اور بڑے اور سردار شخص کو بھی ''**عبقری**'' کہا جانے لگا۔حدیث میں ہے کہ **انه كان يسجد على عبقرى** آپ **عبقری** پر سجدہ کرتے تھے۔ یہاں **عبقری** اس تکیہ کو کہا گیا ہے جس میں رنگ اور نقوش ہوں تو اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) انہیں ان کے معروف لفظ سے مخاطب کرتے ہوئے ''**عبقری حسان**'' ارشاد فرمایا۔

(۷۷) **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (ترجمہ:۔تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

(۷۸) **تَبٰرَكَ اسۡمُ رَبِّكَ ذِى الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ** (ترجمہ:۔بڑی برکت والا نام ہے تیرے رب کا جو عظمت وبزرگی والا ہے) اللہ کے نام کے بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ (شریک وغیرہ سے) پاک منزہ ہے بلند ہے عظمت والا ہے۔یہ صفات کسی غیر کے لئے نہیں ہوسکتیں۔اسی سے ہے۔ **تبارک الذی بیده الملک** ابوالعباسؓ سے ''**تبارک**'' کی تفسیر کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس کے معنی ہیں ''**ارتفع**'' زجاج نے کہا ہے کہ یہ لفظ تفاعل کے وزن پر ہے اور ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ **تبارک** کے معنی ہر خیر میں کثیر برکت ہیں ایک اور جگہ کہا کہ **تبارک** کے معنی ہیں **تعاظم وتعالیٰ**۔اور ابن الانباری نے کہا ہے کہ **تبارک** کے معنی یہ ہیں کہ ہر کام میں اس کے نام سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔اور **ذی الجلال** کے معنی ہیں عظمت والا' اور جلال کا لفظ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔حدیث میں ہے کہ **الظو بیاذالجلال والاکرام** یعنی **جلال واکرام** والی ذات کے ساتھ وابستہ ہوجاؤ۔مطلب یہ کہ **یا ذالجلال والاکرام** کہکر اس کی عظمت بیان کرو۔اور جلیل' جلال کے صفات کے ساتھ موصوف اور ان تمام پر حاوی ذات کو کہا جاتا ہے وہی **جلیل** مطلق ہے اور یہ لفظ صفاتِ کمال کی طرف راجع ہے۔جیسے کہ کبیر کا لفظ کمالِ ذات کی طرف اور عظیم کا لفظ کمالِ ذات اور کمال صفات دونوں کی طرف راجع ہے۔جمہور نے لفظ **ذی الجلال**' کو **ربک** کی صفت کے طور پر پڑھا ہے۔اور ابن عامر شامی اور اہل شام نے اسے ''**اسم**'' کی صفت کے طور پر پڑھا ہے۔کہا گیا ہے کہ لفظ ''**اسم**' بطور تعظیم کے ہے جیسا کہ **یبقیٰ وجه ربک** میں لفظ '' **وجه**'' بطور عظمت کے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ''**یبقی ربک**''